اشہد رفیق ندوی

مولانا فراہیؒ اور اصول تفسیر

مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول: "چوتھی صدی ہجری تک علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی، اس داءِ عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لیے قدم اٹھاتا تھا کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اسی کے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی ہجری تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے۔ کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تفسیر سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔"[1]

مولانا حمید الدین فراہیؒ کا شمار مولانا آزاد کے لفظوں میں ان شواذ و نوادر میں کرنا چاہیے جنھوں نے اس معروف اور سہل طریقۂ تصنیف کو چھوڑ کر بحث و تحقیق کی راہ اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جو چیزیں منظر عام پر آئیں اگرچہ وہ اسلاف کے فکر و خیال سے الگ نہیں ہیں، مگر ان سب میں ان کی تبحر علمی، جودت طبع اور مجتہدانہ ذوق کی شان نمایاں ہے۔

علوم اسلامیہ میں غالباً سب سے مظلوم فن اصول تفسیر ہے جس پر چند مختصر رسائل اور بعض تفسیروں کے مقدمات کے علاوہ باقاعدہ کچھ لکھا نہیں گیا ہے۔ سب سے پہلے ایک فن کی حیثیت سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ (متوفی ۷۲۸ھ) نے متعارف کرایا، انھوں نے

---

[1] ابوالکلام آزاد۔ ترجمان القرآن، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی ۱۹۸۹ء، ۱/۳۲

زیر بحث موضوع پر ایک مختصر رسالہ "المقدمۃ فی اصول التفسیر" تصنیف فرمایا، اس کے علاوہ بعض کتابیں اور رسائل منظر عام پر آئے، جن میں شاہ ولی اللہ دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) کی الفوز الکبیر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ تفسیروں کے مقدمات میں مقدمہ تفسیر مظہری، مقدمہ البحر المحیط، مقدمہ تفسیر قرطبی، مقدمہ ابن کثیر، مقدمہ تیسیر الرحمٰن، مقدمہ تفسیر المنار، اور اردو میں مقدمہ تفسیر حقانی، مقدمہ تفہیم القرآن، مقدمہ تدبر قرآن زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مقدمات میں اصول تفسیر سے متعلق بڑی قیمتی بحث کی گئی ہے۔ لیکن ان مقدمات کی حیثیت چوں کہ مقدمۂ کتاب کی ہے اس لیے ان کے مصنفین نے اپنی تفسیروں کی خصوصیات بیان کرنے پر زیادہ زور دیا ہے اور فنی مباحث پر کما حقہٗ بحث نہیں کی ہے۔

مولانا فراہیؒ نے اصول تفسیر پر متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں التکمیل فی اصول التاویل، دلائل النظام اور اسالیب القرآن[1] کے علاوہ خود ان کی تفسیر کا مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں مولانا فراہیؒ کی تحریروں کی روشنی میں ان کے تفسیری اصولوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے، نیز بعض مواقع پر قدما کی رایوں سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

کسی فن کی ترویج وارتقاء کے لیے اصول وضوابط کی کلیدی حیثیت ہوتی ہے اسی وجہ سے ماہرین فن ہمیشہ اس کے حدود وقیود اور اصول وضوابط مقرر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں متعلقہ فنون پر کام ہو، نیز یہی اصول کھرے اور کھوٹے کے درمیان وجہ امتیاز بن سکیں۔

علوم اسلامیہ میں علم تفسیر کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ تفسیر کتاب اللہ کی تفہیم وتشریح کا نام ہے جو تمام علوم اسلامی کا منبع وماخذ اور تمام بنی نوع انسان کے لیے ذریعہ ہدایت ہے، اس لیے اس کے اصول کی اہمیت وافادیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون کے اصول تو

---

[1] یہ تینوں رسائل، رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن کے نام سے حال ہی میں دائرہ حمیدیہ سرائے میر، اعظم گڑھ سے مجموعہ کی شکل میں دوبارہ شائع ہو گئے ہیں۔

منضبط ہو گئے، مگر تفسیر کو اصول فقہ کا جز مان کر اس کی تدوین وترتیب کی جانب کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی، جب کہ سب سے پہلے اسی کی جانب توجہ ہونی چاہیے تھی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ تفسیروں میں بکثرت اختلافات رونما ہو گئے۔ عام طور پر لوگوں نے روایات کے ذریعہ آیات قرآنی کی تفسیر شروع کی، اور صحیح وسقیم کی تمیز نہیں کی، اسی طرح فلاسفہ اور متکلمین نے اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے من مانی تاویلات کی ایسی طرح ڈالی کہ جس کا قرآن اور روح قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔

مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'التکمیل فی اصول التاویل' کے ابتدائی صفحات میں موضوع کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ایک علیحدہ فن کی حیثیت سے اس کے اصول وضوابط مقرر کرنے پر زور دیا ہے اور اس کے فوائد شمار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "(۱) اس سے غلطیوں کا امکان کم ہو جاتا ہے، (۲) کتاب اللہ کے اسرار وحکم کی بازیافت ہوتی ہے، (۳) ہدایت کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں، (۴) متشابہات کے بارہ میں بھٹکنے کا امکان نہیں رہتا، (۵) اور تفسیر بالرائی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔"[2]

اسی احساس کے تحت انھوں نے اس فن کی ترتیب نو کے لیے ایک عظیم الشان خاکہ تیار کیا اور اس خاکہ میں رنگ بھرنے کے لیے کئی کتابیں لکھنی شروع کیں، مگر یہ منصوبہ اتنا بڑا تھا کہ تنہا ایک شخص کے لیے اس کا حق ادا کرنا ممکن نہ تھا، اسی وجہ سے اکثر کتابیں ناتمام رہ گئیں، مگر ان کتابوں میں ایسے واضح راہ نما خطوط موجود ہیں جن کی روشنی میں اسے منظم شکل دی جا سکتی ہے۔

قرآن مجید کی تفسیر کے لیے سب سے پہلے اس کے وسائل کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے انھیں اساسی اور فروعی میں تقسیم کیا ہے اور اصل واساس صرف قرآن مجید کو قرار دیا ہے۔ اس طرح فہم قرآن کے لیے جو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہیں ان کی انھوں نے نشان دہی کی ہے۔ اس ضمن میں تفسیر القرآن بالقرآن کے اصول کو اولیت دی ہے

---

[2] التکمیل فی اصول التاویل، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر [illegible]ھ، ص ۲

جس میں لغت، کلام عرب، اسالیب اور سب سے بڑھ کر نظم کا سہارا لینے پر زور دیا ہے۔ باقی تائید کے لیے حدیث، صحف سماویہ اور تاریخ عالم کو بھی وسائل تفسیر میں گنایا ہے۔

تفسیر قرآن کے بنیادی اصول

تفسیر کے ان وسائل اور مآخذ پر مولانا نے اپنے مقدمۂ تفسیر اور دیگر اصولی کتابوں میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ کسی آیت کی تاویل کے سلسلہ میں بھی کچھ بنیادی اصولوں کی طرف انھوں نے رہنمائی کی ہے جن سے آیت کے مفہوم میں متعدد احتمالات ہونے کی صورت میں یا کثرت اختلافات کو رفع کرنے کے لیے مدد لی جاسکتی ہے۔ ایسے اصولوں کو انھوں نے تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) بنیادی اصول (۲) ترجیحی اصول (۳) باطل اصول

۱۔ **بنیادی اصول**: اس ضمن میں چار امور کی نشان دہی کی ہے:

(الف)۔ کلام کی معرفت کے لیے اس کے بعض حصّوں کا بعض سے تقابل اور نظائر جس کا نام تفسیر القرآن بالقرآن ہے۔

(ب)۔ نظم کلام اور سیاق و سباق سے جو تاویل سامنے آئے اسے قبول کرنا کیونکہ کلام ایسے معنی کا متحمل نہیں ہوتا جو اس کے نظم اور سیاق کے موافق نہ ہو۔

(ج)۔ شاذ معانی کا اعتبار نہ ہوگا، یعنی قرآن کے الفاظ کا وہی مفہوم معتبر ہوگا جو معلوم و مشہور اور ثابت و مسلّم ہو۔ کیوں کہ وہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے، اس لیے وہ فصیح، معروف اور واضح کو چھوڑ کر شاذ، منکر اور غریب لفظ استعمال نہیں کر سکتا۔

(د)۔ خطاب اور مخاطب کو مدّنظر رکھنا، اس سے کلام کا رُخ متعین ہو جاتا ہے اور اس کے لب و لہجہ کا پتہ چلتا ہے کہ وہ تسلی و تثبیت کے لیے آیا ہے یا زجر و توبیخ کے لیے، رافت پر مبنی ہے یا غضب پر، اور وعدہ ہے یا وعید، نیز استدلال کا کیا طریقہ ہے؟۔

۲۔ **ترجیحی اصول**: اس سے مراد مولانا فراہیؒ کے نزدیک ایسے اصول ہیں جو کلام میں مختلف احتمالات کی صورت میں قریب الصحۃ معنی تک پہنچنے میں معاون ہوتے ہیں۔ وہ اصول

درج ذیل ہیں:

(الف)۔ کلام میں اگر متعدد احتمالات ہوں تو اس احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہو۔

(ب) کلام کی جب مختلف توجیہیں سامنے ہوں تو اس مفہوم کو ترجیح دی جائے گی جو موقع و محل اور عمود کلام سے زیادہ موافق ہو۔ ہر کلمہ کے اطراف و جہات ہوتے ہیں، جن کی حیثیت معانی کی ہوتی ہے، اور ہر امر واقعہ کے اعتبارات مختلف ہوتے ہیں۔

(ج)۔ ہمیشہ کلام میں احسن پہلو کو ترجیح دی جائے گی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو احتمال معالی اور مکارم اخلاق کے شایانِ شان ہو، محکماتِ قرآنی کے موافق ہو، اللہ و رسول سے زیادہ حسن ظن پر مبنی اور عربیت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہو، وہ قابل ترجیح ہوگا۔

(د) اگر معنی کسی ایسی عبارت کا مقتضی ہو جو کلام میں مذکور نہیں ہے تو یہ مرجوح ہوگا۔

۳۔ **باطل اصول**: مولانا فراہیؒ کے نزدیک ایسے تمام اصول باطل ہیں جو قرآن و سنت کی روح کے منافی ہوں، جیسے نصوص شرعیہ کے مقابلہ میں عقل و دانش کا استعمال اور روایات و آثار کو اصل قرار دے کر قرآن کریم کو ان کے مطابق بنانا وغیرہ[1]

ایک آیت کی ایک ہی تاویل

قرآن مجید میں جن مقامات پر ایک ہی آیت کے کئی معانی کا احتمال ہوتا ہے تو قدیم مفسّرین ایسے مواقع پر تمام احتمالات نقل کر دیتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ مذکورہ احتمالات میں راجح و مرجوح کا فرق واضح کر دیتے ہیں، اور کچھ لوگ اس کا فیصلہ بھی قاری پر چھوڑ دیتے ہیں، مولانا فراہیؒ اس طریقۂ تفسیر کے سخت مخالف ہیں، انھوں نے متعدد مقامات پر زور دے کر لکھا ہے کہ ایک آیت ایک ہی آیت کی متحمل ہو سکتی ہے، اس لیے کسی آیت کی تفسیر کرتے وقت تمام اصول تفسیر کو پیش نظر رکھ کر ایک ہی تفسیر کرنی چاہیے، رسول اللہ

---

[1] التکمیل فی اصول التاویل، ص ۵۲-۶۸

صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ایک آیت کا ایک سے زیادہ مفہوم نہیں بیان کیا، اور نہ صحابہ کرام کے اقوال میں ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں، کیوں کہ نظائرِ قرآن پر وہ براہِ راست اعتماد کرتے تھے۔

قدیم مفسرین میں امام ابن جریر طبری نے یہ طرح ڈالی کہ کسی آیت کے سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، تابعین عظام سے جو اقوال یا رائیں بھی منقول ہوں سب جمع کر دی جائیں۔ پھر جب فلسفیانہ موشگافیوں کا دور شروع ہوا تو قیل و قال کی راہیں وسیع تر ہو گئیں۔ اسی بنیاد پر امام رازی نے کئی جلدوں میں اپنی تفسیر مکمل کی اور اس پر سب سے بڑا الزام یہ آیا کہ "اس میں سبھی کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔ اس کے بعد تفسیروں کا یہ عام طرز ہو گیا کہ زیادہ سے زیادہ اقوال نقل کیے جائیں۔

مولانا فراہیؒ کا کہنا ہے کہ ایک آیت ایک ہی تاویل کی متحمل ہو سکتی ہے، اس لیے تفسیر کے تمام اصول و آداب کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آیت کے کسی ایک مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے، بکثرت اقوال نقل کرنے سے اختلافات کے دروازے وا ہوتے ہیں اور معاندین کو موشگافی کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

مولانا فراہیؒ نے بکثرت اقوال نقل کرنے کے اسباب و علل کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ اکثر طبیعتیں اجمال پر قناعت نہیں کرتیں اور وہ تفصیل کی طالب ہوتی ہیں، مثلاً ان کے سامنے اگر قیامت کا ذکر آتا ہے تو فوراً یہ سوال کر بیٹھتی ہیں کہ کب آئے گی کیوں آئے گی اس کی علامات کیا ہیں؟۔۔

۲۔ اکثر لوگ ہر چیز کو مجسم اور مشخص بیان کیے جانے کے آرزومند ہوتے ہیں، اس لیے وہ مجرد علم و حکم سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ان کے نام، شکل اور مکان سے ان کو جاننا چاہتے ہیں، اس قسم کی طبیعت اور مزاج رکھنے والوں کے لیے تفسیروں میں قصے اور ان کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں، اس طرح قرآن مجید میں جو باتیں مذکور نہیں ہیں وہ بھی تفسیروں میں نقل و بیان کر دی جاتی ہیں۔

۳۔ مذہبی اور سیاسی ضروریات بھی کبھی کبھی رکیک تاویلات کا باعث بنتی ہیں، اور ان سے بحث و جدال کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

۴۔ علم کلام کی ترویج کے بعد فلسفی مفسرین نے اپنے موقف کو مدلل کرنے کے لیے تاویلات کا سہارا لیا اور متعدد مقامات پر جائز حدود کو بھی پار کر گئے۔[1]

تفسیروں میں اختلافات کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد مولانا فراہیؒ نے ان سے بچنے کے لیے بھی کچھ اصول وضع کیے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ تاویل کے گوناگوں احتمالات بسا اوقات الفاظ میں یا آیت کے مجموعی مفہوم میں اشتراک کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں مواقعِ استعمال کو فیصلہ کن ماننا چاہیے، کیونکہ قرآن مجید میں آیات کی تکرار بے مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اس میں نہایت عظیم حکمت مضمر ہوتی ہے اور اس سے واقفیت سیاق و سباق، نظمِ کلام اور محلِ استعمال کے گہرے مطالعہ سے ہی ممکن ہے۔

۲۔ جب کسی لفظ میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ لفظ اس معنی و مفہوم کے لیے زیادہ مناسب و موزوں ہے یا دوسرا لفظ، جس کو قرآن نے ترک کر دیا ہے۔ چونکہ قرآن مجید واضح، بہتر اور مناسب لفظ کو نہیں چھوڑتا، اس لیے مفہوم کو چھوڑ دینا چاہیے، جو قرآن کے لفظ سے نہیں نکلتا۔ اور اس معنی کو اختیار کرنا چاہیے جو زیادہ صائب ہو۔ مولانا فراہیؒ اس کی مثال سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۴ "وعلی الذین یطیقونہ۔۔۔" کو پیش کرتے ہیں، لفظ "اطاقہ" بالعموم جسمانی قوی کے سلسلہ میں آتا ہے۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کے معنی نطرہ ادا کرنے کی استطاعت لیا ہے[2] مولانا فراہی کے بقول یہ مفہوم سیاق و سباق اور قرآن کے لسانی اعجاز کے خلاف ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عام طور پر لوگ یطیقونہ میں "ہ" کا مرجع صوم کو مانتے ہیں، اس

---

[1] التکمیل فی اصول التاویل ۲۰-۲۲

[2] الفوز الکبیر فی اصول التاویل (ترجمہ سلمان الحسینی) لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۸۰

سے سارے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کا مرجع صوم نہیں طعام ہے، جس کا ذکر آگے آرہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں پوری بات یوں تھی: "وعلی الذین یطیقون طعام مسکین فدیة طعام مسکین (اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہوں تو ان کے لیے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے)۔ لیکن اس صورت میں جملہ نہایت ثقیل ہو جاتا، اس وجہ سے کلام کی روانی، ایجاز اور بلاغت کا تقاضا یہ ہوا کہ ایک جگہ طعام مسکین کو حذف کر کے اس کی جگہ ضمیر لائی جائے، اور دوسری جگہ جہاں اس کا ذکر ناگزیر ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے تاکہ کلام غیر ضروری تکرار کے عیب سے پاک ہو جائے۔

اس تاویل کو قبول کر لینے کے بعد مسئلہ کی جو شکل سامنے آئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ پہلے جو روزے فرض ہوتے تھے اس میں اس بات کی گنجائش تھی کہ اگر لوگ روزے نہ رکھنا چاہیں تو اس کا بدل مسکین کو کھانا کھلا کر پورا کر دیا کریں، بلکہ قرآن کے الفاظ سے اس کی اصل شکل یہ سامنے آتی ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہیں کر سکتے تھے ان کو اس بات کی اجازت تھی کہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر ان چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کر دیں، یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا بدل پورا کر دیں۔ گویا اس وقت قضا روزوں کی تلافی مسکین کو کھانا کھلا کر بھی ہو سکتی تھی بعد میں یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔"[1]

۲۔ قرآن مجید کے اسلوب کی خصوصیات کے علم سے بھی احتمالات کی کثرت رفع ہوتی ہے۔ دراصل ہر شخص کی بات کا ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے، اگر اس کی رعایت نہ کی جائے اور اپنی عادت کے مطابق تاویل کی جائے تو مفہوم میں غلطی ہو جائے گی، مثلاً قرآن مجید کا ایک اسلوب ایجاز ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف طبقۂ خیال کے لوگوں کو ایک عام جواب دینے پر

---

[1] تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۵ء، ۱/۴۴۹

اکتفا کرتا ہے، اور اس کے عموم و اشتراک میں وہ سب کو شامل کر لیتا ہے۔ اس اسلوب میں یہ حکمت ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کی غلطی سے متنبہ ہو کر اپنی اصلاح کر لے۔

۴۔ ان باتوں کے علاوہ تفسیر قرآن کے بنیادی اصول و آداب، متن قرآن کی روح، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، آسمانی کتابوں کے مندرجات اور تاریخی و معاشرتی پس منظر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان باتوں سے خود بخود آیت کا کوئی ایک منشا یا آیت کی ایک تاویل واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔[1]

تفسیر قرآن کے لیے کتب تفسیر کی اہمیت

علوم اسلامیہ میں ایک بہت بڑا ذخیرہ تفاسیر کا ہے۔ صدر اول ہی سے علماء اسلام نے اس جانب خصوصی توجہ دی ہے، اور مختلف خصوصیات کی حامل متعدد تفسیریں لکھی گئیں۔ ان میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو بس یہ کہ اس میں "نقل در نقل" بہت زیادہ ہے۔ مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں بھی یہی مروجہ طریقہ پسند کیا گیا اور چند منتخب تفاسیر پڑھانے یا مختلف مفسرین کے اقوال طلبہ کو سنا دینا کافی سمجھا گیا۔

مولانا فراہیؒ نے اس طریقہ کو نامناسب خیال کرتے ہوئے اس کے بالمقابل براہ راست قرآن مجید پر خود قرآن کی روشنی میں دوسرے مقتضیات کے ساتھ غور کرنے کا طریقہ رائج کیا، اور اسی طریقہ کے مطابق برسہا برس تعلیم دیتے رہے۔

جہاں تک ان کے طریقۂ تالیف کا تعلق ہے اس کی وضاحت مولانا نے مقدمہ تفسیر کی ابتدائی سطروں میں خود کر دی ہے کہ:

> "میں نے آیات کے معانی کی تفسیر کتابوں سے نہیں کی ہے، بلکہ خود آیات پر ان کے سیاق و سباق اور مماثل آیات کی روشنی میں غور کیا ہے، اسی طرح جب چند آیتوں کے معنی روشن ہو گئے ہیں،

---

[1] التکمیل فی اصول التاویل ص ۲۹-۳۱

تب میں نے تفسیر رازی یا تفسیر طبری اٹھائی ہے۔ ان میں کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ کوئی قول سلف کا میرے موافق مل گیا ہے، کبھی میں سلف کے قول کے بالکل قریب پہونچ گیا، اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ جو معنی میری سمجھ میں آتے تھے، ان سے مجھے رجوع کرنا پڑا، اور ایسا بھی بارہا ہوا کہ کوئی مشکل ایسی پیش آگئی جس کے لیے مجھے عرصہ تک توقف کرنا پڑا۔" [1]

---

[1] مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۴۷